بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

ناظرین ترجمان القرآن میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں:

"آپ کی نظر میں نہ موجودہ لیڈروں میں، نہ عوام میں، کوئی اس قابل ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے یا کہلانے کا مستحق ہو، نہ موجودہ دور کی سیاسی کشمکش میں ان نام نہاد مسلمانوں کی بہبودی کی جدوجہد مستحسن ہے۔ پھر برائے خدا یہ بتلائیے کہ یہ مسلمان کس نام سے اس وقت پکارا جائے اور اس پر جو ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں ان سے بچنے کے لیے کسی تدبیر کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟

"یہ سچ ہے کہ دورِ حاضر کے مسلمان برے ہیں۔ مذہب کی پابندی نہیں کرتے۔ لیکن آخر کیا انہیں ڈوبتا ہی چھوڑ دیا جائے؟ . . . کیا جس وقت تک سب راہِ راست پر نہ آجائیں اُس وقت تک نہ اپنے آپ کو کوئی مسلمان کہے نہ انکی بہتری کے واسطے انہیں جیسے مسلمانوں کی طرف سے کوئی جدوجہد کی جائے؟ . . . . ڈوبتے ہوئے سے یہ کہنا کہ تو گہرے پانی میں گیا ہی کیوں اور تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں ہے سراسر خلافِ انسانیت ہے۔ ضرورت تو اسکی ہے کہ اسے نکالنے کی کوشش کی جائے اور ہر ممکن تدبیر اسکی جان بچانے کی عمل میں لائی جائے۔"

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں:-

"آپ کی روش میرے لیے اور مجھ جیسے خیالات رکھنے والے بہت سے لوگوں کے لیے سخت وجہ پریشانی بن گئی

> ہے۔ جب تک آپ نیشنلسٹ مسلمانوں یا کانگریس سے تعاون کرنے والے مسلمانوں کے طرز عمل پر تنقید کرتے رہے، ہم نے یہ سمجھا کہ آپ ہندوستان میں مسلمانوں کی انفرادیت برقرار رکھنے کے حامی ہیں اس لیے ان لوگوں سے اختلاف رکھتے ہیں جنکے رویہ سے آپ کو خطرہ ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی ہستی گم ہو جائیگی۔ مگر اب آپ نے اُن دو تحریکوں اور ان کے لیڈروں پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی ہے جو اس انفرادیت کے تحفظ ہی کے لیے کوشاں ہیں، یعنی مسلم لیگ اور خاکسار تحریک۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ آخر چاہتے کیا ہیں۔ ہندوستان میں اگر مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے تو بہر حال یہ ضروری ہے کہ وہ کسی مرکز پر جمع ہوں، ایک منظم گروہ بنیں، کسی قیادت کے تحت حرکت کریں۔ اس مقصد کے لیے جو کوشش کی جاتی ہے اس سے آپ کا اختلاف کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر آپ مذہبیت کا احیاء چاہتے ہیں تو یہ بھی تب ہی ہو سکے گا کہ مسلمانوں کا ایک اجتماعی نظام بن جائے فی الحال بری یا بھلی، جیسی بھی ہے، جماعت تو بن رہی ہے۔ اس کا ساتھ دیجیے۔ پھر مذہبی احیاء کے لیے بھی کوشش کر لیجیے گا۔ لیکن آپ کی روش سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں ان میں سے کسی کا ساتھ بھی آپ دینا نہیں چاہتے"۔

مشتے نمونہ از خروارے۔ یہ من جملہ ان بہت سے شکایتی اور احتجاجی خطوط کے ہیں جو کچھ مدت سے میرے پاس آ رہے ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک بہت بڑا گروہ اسی طرز پر سوچ رہا ہے اور ان خطوط میں دراصل اسی کے طرز خیال کی نمائندگی کی گئی ہے۔ اگر محض چند افراد کے یہ خیالات ہوتے تو انکو یہاں نقل کر کے برسرِ عام جواب دینے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن جبکہ ایک گروہ کثیر اس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہے، تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کھل کر کچھ صاف صاف باتیں کہہ دی جائیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ احتساب نفس، اپنے اوپر آپ تنقید کرنا، اور اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینا کوئی خوش آیند چیز نہیں ہے۔ میں بھی اس کام کو خوش آیند سمجھ کر نہیں کرتا۔ بڑا تلخ گھونٹ، زہر کا گھونٹ ہے

جیسے حلق سے اتارتا ہوں، اور اچھی طرح اُس تلخی کو محسوس کرتا ہوں جو میرے دوسرے بھائی اسکے اندر پاتے ہونگے۔ اس احساس کے باوجود میرا ضمیر تقاضا کرتا ہے کہ اس تلخی سے بچنے کے بجائے اسے گوارا کرنا چاہیے۔ تلخی تو واقع میں موجود ہے۔ تغافل کا فائدہ اسکے سوا کچھ نہیں کہ اپنے احساس کو حقیقی اور واقعی تلخی کے ادراک سے معطل کرلیا جائے۔ دوسروں کی چیرہ دستیوں اور جارحانہ کارروائیوں پر شکوہ سنج ہونا اور اپنی کمزوریوں اور غلطیوں سے نہ صرف غفلت برتنا بلکہ انکے لیے جواز و استحسان کے دلائل ڈھونڈھنا بہت خوشگوار چیز ہے جس سے دل خوب بہلتا ہے، مگر اسکی حیثیت مارفیا کے انجکشن کی سی ہے۔ یہ ایک پینک ہے جس کے نشے میں مریض سو تو جاتا ہے، مگر وہ اندرونی خرابیاں دور نہیں ہوتیں جنکے سبب سے بیرونی آفات کو اس پر تسلط حاصل ہوتا ہے۔ میرے بھائی چاہتے ہیں کہ میں بھی اُنہیں اِسی پینک کی خوراکیں دیا کروں۔ انکی خواہش ہے کہ جس خیالی جنت میں وہ جی رہے ہیں، جن سرابوں سے وہ چشمۂ حیوان پانے کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں، اور جن غلط فہمیوں کا دلفریب طلسم انہوں نے اپنے گرد بنا رکھا ہے، ان سب چیزوں کو جوں کا توں رہنے دوں، بلکہ اگر ہو سکے تو خود بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں جنکے لیے ان چیزوں کا سراہنا دین و ملت کی سب سے بڑی خدمت بنا ہوا ہے۔ اس خدمت کے فوائد بھی مجھے معلوم ہیں، مگر میں مجبور کہ مجھے محبوب دشمن کے بجائے مبغوض دوست بننا زیادہ مرغوب ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی

مسلمانوں کا مفاد، مسلمانوں کی فلاح و بہبود، مسلمانوں کی تنظیم، مسلمانوں کی جمعیت و مرکزیت، مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی، یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ذکر بار بار زبانوں پر آتا ہے۔ میں بھی یہ ذکر کرتا ہوں، زید بھی کرتا ہے، بکر بھی کرتا ہے، اور ہر ایک شخص جو اس گروہ میں شامل ہے، انہی الفاظ سے اپنے مدعا کے اظہار میں کام لیتا ہے۔ مگر اسکے باوجود ہمارے عمل کی راہوں میں اختلاف ہے۔ ایک کسی طرف جا رہا ہے، دوسرا کسی اور طرف، تیسرا کسی اور طرف۔ آخر اسکی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ محض اتفاقی امر ہے؟ یا اسکی تہ میں کوئی بنیادی سبب ہے، جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟

میرے نزدیک اسکی وجہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان الفاظ مشترک ہیں مگر معنی و مفہوم میں اختلاف ہے۔ ایک ہی لفظ ہے "مسلمان"، لیکن میں اس سے کچھ اور مراد لیتا ہوں، اور دوسرے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے مفاد، فلاح و بہبود، تنظیم، جمعیت و مرکزیت، ترقی و خوشحالی اور ہر ایک چیز جو لفظ "مسلمان" کی نسبت سے بولی جاتی ہے، ہمارے درمیان مختلف المعنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی اُلجھن کے سبب سے غلط فہمیاں واقع ہوتی ہیں، اور جب لوگ اسے سلجھانے سے عاجز رہ جاتے ہیں تو شکایات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تم کو مسلمانوں کے مفاد اور فلاح و بہبود اور ترقی و خوشحالی وغیرہ سے ہمدردی نہیں، جمعیت بن رہی ہے، مرکزیت پیدا ہو رہی ہے اور تم اسکی مخالفت کرتے ہو، مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام ہوتا ہے اور تم اس میں روڑے اٹکاتے ہو۔ حالانکہ ایک شخص ان الفاظ کا اطلاق جن مخصوص و متعین چیزوں پر کرتا ہے، دوسرے کے نزدیک اُن پر یہ الفاظ منطبق ہی نہیں ہوتے، ورنہ ظاہر ہے کہ کون کافر ہوگا جس کو فی نفسہٖ فلاح مسلمین وغیرہ سے دشمنی ہو۔

آیئے، ذرا تحقیق کرکے دیکھیں کہ اس اُلجھن کی نوعیت کیا ہے۔

مطلق اور مقیدؔ کا فرق ایک ایسی واضح چیز ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ جب ہم کوئی ایسا لفظ بولتے ہیں جس میں اطلاق اور عموم ہو تو اسکے استعمال میں وسعت ہوتی ہے، اور جب اسے کسی قید کے ساتھ مقید کر دیا جاتا ہے تو اس قید کا لحاظ کیے بغیر اس لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً جب ہم رنگ بولتے ہیں تو اسکا استعمال ہر رنگ پر ہوگا۔ کوئی چیز خواہ سیاہی میں ترقی کرے، یا سفیدی میں یا سرخی میں، بہر حال ہم کہینگے کہ اس کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مگر جب رنگ کے ساتھ ہم سفید کی قید لگا دیں تو سیاہ، سرخ، سبز اور دوسرے رنگ کی چیزوں پر ہم اس لفظ کا اطلاق نہ کر سکینگے، اور سیاہی یا سرخی میں ترقی کرنے کو سفید رنگ کی ترقی کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح مثال کے طور پر لفظ "قافلہ"

کو لیجیے۔ ہر قافلہ جو کسی طرف جا رہا ہو، اس لفظ سے موسوم ہو سکتا ہے، جس طرف بھی وہ بڑھے، اس کی پیش قدمی کو پیش قدمی کہا جا سکتا ہے۔ ہر شخص اسکا میر قافلہ بن سکتا ہے، ہر گاڑی پر وہ سفر کر سکتا ہے، ہر قسم کا زادِ سفر اس کا زادِ سفر ہو سکتا ہے، غرض اصل کے مطلق ہونے کی وجہ سے ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو مطلق ہی ہوگی۔ لیکن جب عزمِ پشاور کی قید سے مقید کر کے "قافلۂ پشاور" کہہ دیا جائے تو پھر وہ عموم باقی نہیں رہ سکتا جو محض قافلہ ہونے کی صورت میں تھا۔ "قافلۂ پشاور" کا اطلاق صرف اسی قافلہ پر ہوگا جو عازم پشاور ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جا تو رہا ہو مدراس یا بمبئی کی طرف اور کہلائے قافلۂ پشاور۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو، پشاور کی قید سے مقید ہو جائیگی۔ مثلاً قافلۂ پشاور کی پیش قدمی کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ پشاور کی سڑک پر چل رہا ہے۔ اگر وہ کسی دوسری سڑک پر بڑھ رہا ہو تو اسے قافلۂ پشاور کی پیش قدمی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اسے پیش قدمی کے بجائے رجعت کہا جائیگا، کیونکہ دوسرے راستے پر جتنے قدم وہ چلے گا پشاور کی نسبت سے دور ہوتا چلا جائیگا۔ اس کا میر قافلہ بھی صرف وہی ہو سکتا ہے جو پشاور کا راستہ جانتا ہو۔ دوسرے راستوں کے علم میں کوئی شخص خواہ کتنا ہی ماہر ہو، اگر وہ پشاور کی راہ سے ناواقف ہے تو بہر حال وہ قافلۂ پشاور کا سردار نہیں بن سکتا۔ اسی پر دوسرے تمام امور کو بھی قیاس کر لیجیے۔

اب دیکھیے کہ اُلجھن کس طرح پیش آتی ہے۔ قافلہ ہی کی مثال کو لے لیجیے۔ ایک قافلہ کا نام تو ہے "قافلۂ پشاور"۔ مگر آپ یا تو پشاور کی قید کو بھول کر اسے محض قافلہ سمجھ لیتے ہیں۔ یا آپ کو پشاور کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ یا آپکا خیال یہ ہے کہ اس قافلہ کے لوگ جب ایک دفعہ "قافلۂ پشاور" کے نام سے موسوم ہو چکے ہیں تو اب یہ پشاور کے سوا جس رخ پر چاہیں سفر کریں بہر حال انہیں کہنا چاہیے قافلۂ پشاور ہی۔ بخلاف اسکے میں قافلۂ پشاور کو اسکے اصلی معنی میں لیتا ہوں اور پشاور کی قید کو نظر انداز

کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قافلہ کے بارے میں جتنی گفتگو ہوتی ہے، میرے اور آپ کے درمیان بات بات پر تصادم واقع ہوتا ہے۔ جب تک بات مجمل رہتی ہے ہم متفق رہتے ہیں۔ قافلہ کے منتشر مسافروں کو جمع کیا جائے، انہیں دوسرے قافلوں میں گم نہ ہونے دیا جائے، رہزنوں سے انکی حفاظت کی جائے، ان کے لیے زادِ راہ درکار ہے، انہیں ایک میرِ قافلہ کی ضرورت ہے، انکو منظم طور پر تیز رفتاری سے منزل کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے، یہ سب باتیں مبہم اور مجمل الفاظ میں جب تک کہی جاتی ہیں، میں اور آپ دونوں ان سے اتفاق کرتے ہیں۔ مگر جب انہی چیزوں کے تعین کا وقت آتا ہے تو آپ کے اور میرے خیالات میں بعدُ المشرقین پایا جاتا ہے۔ ایک شخص آتا ہے اور اس قافلہ کے لوگوں کو جمع کر کے بمبئی کی طرف چلانا شروع کر دیتا ہے، دوسرا آتا ہے اور کلکتہ کی طرف چل پڑتا ہے، تیسرا آتا ہے اور کسی اور طرف کا رخ کرتا ہے۔ آپ ہر میرِ قافلہ کے جھنڈے کو دیکھ کر زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں اور پکارنے لگتے ہیں کہ چل پڑا پشاوری قافلہ۔ میں اسی پر اعتراض کرتا ہوں کہ یہ جمعیت اور یہ پیش قدمی قافلۂ پشاور کی جمعیت اور پیش قدمی نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ منتشر مسافر جمع تو ہو رہے ہیں اور صورتِ قافلیہ تو بن رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ بجا و درست مگر محض جمع ہونے اور صورتِ قافلیہ بن جانے کا نام تو "قافلۂ پشاور" بننا نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میرِ کارواں کتنا لائق، منتظم اور مدبّر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ سہی مگر پشاور کا راستہ بھی جانتا ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ دیکھو، کتنی اچھی، تیز رفتار، شاندار گاڑی ہے جس پر یہ قافلہ جا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کی بیان کردہ صفات سے انکار نہیں، مگر یہ گاڑی جا کدھر رہی ہے؟ اگر اسکا رخ پشاور کی طرف نہیں ہے تو قافلۂ پشاور کے لیے موزوں نہیں۔ اس صورت میں تو اسکی تیز رفتاری اور زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ یہ روز بروز قافلہ کو اسکی منزلِ مقصود سے دور تر لے جاتی رہے گی۔ آپ کہتے ہیں کہ صاحب قافلہ بننے اور گاڑی چلنے تو دو، پھر پشاور کی سڑک بھی کبھی لے ہی لینگے

میں عرض کرتا ہوں کہ جب تک عزم پشاور ملتوی ہے اور دوسرے راستوں پر آپ گامزن ہیں اسوقت تک کے لیے نام تبدیل فرما لیجیے۔ مجھے آپکی گاڑی چلنے پر اعتراض نہیں بلکہ اس پر ہے کہ آپ چلیں تو بمبئی یا مدراس یا کلکتہ کی طرف اور نام آپکا قافلۂ پشاور ہی رہے۔ آپ کہتے ہیں کہ حضرت پشاور کی سڑک تو بڑی دشوار گذار ہے، اس وقت اُدھر جانا تو محال ہے، لہٰذا سردست تو قافلۂ پشاور کو دوسرے آسان راستوں ہی پر چلنے دو۔ میں گذارش کرتا ہوں کہ میں نے آپکو دشوار گذار راستہ کی طرف گھسیٹنے پر کب اصرار کیا تھا؟ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ قافلۂ پشاور کا پشاور کے سوا دوسری سمت میں چلنا اور پھر قافلۂ پشاور ہی رہنا متناقض بات ہے۔ آپ اس تناقض کو دور فرما دیں۔

اس تمام بحث میں بنائے نزاع صرف یہ ہے کہ آپ مقید کو مطلق بناتے ہیں اور اس کے تمام متعلقات کو قید سے آزاد کیے دیتے ہیں۔ اور میں مقید کو مقید ہی سمجھ کر بات کرتا ہوں۔ اگر آپ اپنے ذہن کو صاف کر لیں، اور یہ بات سمجھ لیں کہ مطلق قافلہ، اور قافلہ بقید پشاور میں کیا فرق ہے تو کوئی الجھن پیش نہیں آسکتی۔ لیکن آپ سیدھی سمجھ کی بات اختیار کرنے کے بجائے گفتگو کا رخ کچھ دوسری ہی باتوں کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ تم قافلہ کے اجتماع اور اسکی تنظیم اور اسکی پیش قدمی کے مخالف ہو حالانکہ نفس اجتماع و تنظیم اور نفس پیش قدمی سے کس کافر نے انکار کیا تھا۔ کبھی آپ سوال کرتے ہیں کہ یہ قافلہ اگر قافلۂ پشاور نہیں تو اور کس نام سے یاد کیا جائے؟ حالانکہ اُس کا نام تجویز کرنے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میری بات تو صاف ہے۔ اگر یہ پشاور کی سڑک پر ہے تو قافلۂ پشاور ہے۔ اگر اس پر نہیں ہے تو اپنے لیے جو نام چاہے تجویز کرلے، بہرحال قافلۂ پشاور کا نام اس پر راست نہیں آتا۔ آپ چاہیں تو اس امر پر بحث کر لیجیے کہ جس سڑک پر یہ جا رہا ہے وہ پشاور کی سڑک ہے یا نہیں۔ مگر یہ اصول آپکو پہلے تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو اس سڑک پر نہ ہو وہ قافلۂ پشاور نہیں ہے۔ پھر آپ ہمدردی کا سوال چھیڑ دیتے ہیں

حالانکہ ہمدردی اور بے دردی کا یہاں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو واقعہ اور حقیقت کا سوال ہے۔ مدراس یا کلکتہ کی طرف جانے والوں کو آخر میں عازم پشاور کس طرح کہوں؟ جانتے بوجھتے ایک خلاف واقعہ بات باور کرانا آخر ہمدردی کی کونسی قسم ہے؟ میرے نزدیک تو ہمدردی کی صورت یہی ہے کہ صاف صاف لوگوں کو بتا دیا جائے کہ یہ پشاور کی سڑک ہے اور یہ دوسری سڑکیں فلاں فلاں سمت کو جاتی ہیں۔ جو لوگ فی الواقع پشاور جانا چاہتے ہیں مگر راستہ سے ناواقف ہونے کے باعث دوسرے راستوں پر بھٹک رہے ہیں یا بھٹکائے جا رہے ہیں وہ صحیح راستہ معلوم کر لینگے۔ اور جو حقیقت میں جانا ہی دوسری طرف چاہتے ہیں، میں نہ تو انکا راستہ روکنا چاہتا ہوں، نہ ان سے مجھے کوئی دشمنی ہے کہ انسانیت کے خلاف ان کے ساتھ کوئی بے دردی کروں۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ جدھر جانا چاہتے ہیں، سمجھ بوجھ کر پورے شعور کے ساتھ جائیں، اور جب جائیں تو غلط نام کے ساتھ سفر نہ کریں۔

مسلمانوں کے معاملہ میں جو الجھن پیش آ رہی ہے اسکی نوعیت بعینہ وہی ہے جو اوپر کی مثال میں بیان کی گئی ہے۔ مسلمان کا لفظ اسلام سے ماخوذ ہے اور اسلام ایک طریق فکر، ایک مقصد زندگی، ایک کیرکٹر اور طرزِ عمل کا نام ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان صرف اُس کو کہا جائیگا جو زندگی کے تمام معاملات میں وہ خاص طریقِ فکر، وہ خاص مقصد اور وہ خاص طرزِ عمل رکھتا ہو جس کا نام اسلام ہے۔ لفظ ”مسلمان“ کے ان تقیدات کو صاف صاف سمجھ لیا جائے تو مسلمانوں کی فلاح و بہبود، اُن کا مفاد، اُن کی تنظیم، انکی ترقی و خوشحالی، انکی قیادت و امارت، غرض اُن سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کا مفہوم معین ہو جائیگا۔ لیکن اگر ان تقیدات سے قطع نظر کر کے ”مسلمان“ کے لفظ کو مطلقاً ایک گروہ اشخاص کے معنی میں لے لیا جائے تو پھر ہر شخص کو آزادی ہوگی کہ جس چیز کو چاہے مسلمانوں کا مفاد کہہ دے،

جس چیز کو چاہے انکی فلاح و بہبود قرار دے لے، جس نوع کی تنظیم کو چاہے انکی تنظیم سمجھ لے، اور جو شخص بھی انسانی گلّے کو ہانکنے کی قابلیت رکھنے والا نظر آئے اسے مسلمانوں کا قائدِ ملت اور امیر مطاع ماننے پر آمادہ ہو جائے۔

بدقسمتی سے یہاں کچھ ایسی ہی صورت حال درپیش ہے۔ "اسلام" کی قید سے قطع نظر کر کے فی الواقع "مسلمانوں" کو محض ایک گروہِ اشخاص سمجھ لیا گیا ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ عجیب عجیب چیزوں پر مسلمانوں کے مفاد، انکی فلاح و بہبود، انکی تنظیم و جمعیت، انکی قیادت و امارت وغیرہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہنے والے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا مفاد اس میں ہے کہ یہ بینک اور انشورنس اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے استفادہ کریں۔ حالانکہ مسلمان کا لفظ اگر کوئی معنی رکھتا ہے تو اسکی رو سے مسلمان مامور ہیں اِس پر کہ اُس پورے نظام مالیات کو توڑ ڈالیں جو اس وقت دنیا میں قائم ہے اور اپنے اصول پر ایک نیا نظام بنائیں۔ پھر یہ الجھے ہوئے دماغ کی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ مسلمان کی حیثیت سے جس نظام کے ساتھ آپکی اصولی عداوت ہے، اسی میں آپ اپنا مفاد سمجھیں اور پھر اسکا نام "مسلمان کا مفاد" رکھیں؟ اسی طرح سرکاری ملازمتوں اور آئین ساز مجالس کی نشستوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو "مسلمانوں کے مفاد" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مسلمان کے لفظ کو اگر اسلام کی قید سے مقیّد کر کے لیا جائے تو یہ سب چیزیں مسلمان کے مفاد کی ضد ہیں۔ مسلمان کی حیثیت سے تو آپ کا کام اُس نظام حکمرانی کو بدل ڈالنا ہے جسے چلانے کو آپ اپنا مفاد کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح وہ نظام تعلیم جو انگریزوں نے یہاں قائم کیا ہے اس کے تحت اپنی نسلوں کا ذہن تیار کرنا آپ کے نزدیک مسلمان کی فلاح و بہبود اور ترقی کا ذریعہ ہے، اور اس نظام کے تحت آپ خود اپنے خرچ سے درسگاہیں بنا کر ان کا نام اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ کالج اور مسلم یونیورسٹی رکھتے

ہیں، حالانکہ یہ پورا نظام تعلیم انسانیت کی تشکیل اُس نقشہ پر کرتا ہے جس کے بالکل برعکس نقشہ پر اسلام اسکی تشکیل کرنا چاہتا ہے۔

ایسا ہی غلط تصور آپ کے ذہن میں مسلمانوں کی جمعیتِ سیاسی، مسلمانوں کی تنظیم اور مسلمانوں کی قیادت کا بھی ہے۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ اسلام کس تحریک کا نام ہے، اس کا مقصد کیا ہے، اس کے اصول کیا ہیں، اور وہ کیا طرزِ عمل چاہتا ہے؛ تو آپ بڑی آسانی کے ساتھ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُن سیاسی جمعیتوں اور تنظیموں اور اُن قائدوں اور امیروں کی صحیح حیثیت کیا ہے جو اسلام کے نام سے اسوقت برسرِکار ہیں۔ مسلمانوں کی سیاسی جمعیت صرف وہ ہو سکتی ہے جو سیاست و حکمرانی کے اسلامی اصولوں کو لے کر اٹھے اور انہی کو فرماں روا بنانے کے لیے جدوجہد کرے۔ جو لیگ یہ کام ہنیں کرتی وہ مسلم لیگ تو ہنیں ہے، اور جو نام آپ چاہیں اسکے لیے تجویز کر لیں۔ اسلام اگر کسی تحریک کا نام ہے تو اس کا قائد صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو اس تحریک کو جانتا اور سمجھتا ہو اور جو عملاً اس پر کاربند ہو۔ یہ صفت اگر اس میں ہنیں ہے تو وہ دوسری حیثیت سے کیسا ہی لائق اور فرزانہ ہو، بہرحال اسلامی تحریک کا قائد ہنیں ہو سکتا۔ مگر آپ کا قائدِ ملت! اور آپ کا امیرِ لشکر! پہلے صاحب کے متعلق دنیا جانتی ہے کہ وہ اسلام کی الف بے تک سے ناواقف ہیں۔ رہے دوسرے صاحب تو ان کے فضل و کمال کا منتہٰی یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے بنیادی اصولوں تک کو مسخ کر ڈالا ہے اور ایک نئی چیز بنا کر اسلام کے نام سے کھڑی کر دی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود جب آپ کہتے کہ مسلم لیگ اور خاکسار تحریک، بس یہ دو ہی تو مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام کر رہی ہیں اور تو کم بخت ان سے بھی اختلاف کرتا ہے، مسٹر جناح اور علامہ مشرقی، بس یہ دو ہی تو ملت کے ناخدا ہیں، اور تو ان کے ہاتھ پر بھی بیعت ہنیں کرتا، تو میں بجز اس کے کہ آپ کے دماغ کی الجھن اور نظر کی پراگندگی

پر افسوس کروں اور کیا کر سکتا ہوں۔ آپ اسلام کے معنی اور مسلمان کے مفہوم سے واقف ہوتے تو یہ بہکی ہوئی باتیں کیوں کرتے!

ہاں یہ سچ ہے کہ ڈوبنے والوں کو بچانا انسان کا فرض ہے۔ میں بھی اس کو انسانیت کے خلاف سمجھتا ہوں کہ انہیں ڈوبنے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور ان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ کی جائے۔ مگر میں اس کو کیا کروں کہ ڈوبنے اور تیرنے کا مفہوم میرے اور ان کے درمیان متضاد ہے۔ جسے میں ڈوبنا سمجھتا ہوں اسے وہ تیرنا کہتے ہیں۔ جسے میں تیرنا کہتا ہوں اسے وہ ڈوبنا سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک تیرنا یہ ہے کہ آدمی اپنی جان و مال کو اللہ کے ہاتھ فروخت کر دے، اللہ کے سوا ہر ایک کی الٰہیت و ربوبیت سے انکار کر دے، اور دنیا بھر سے اسی ایک معاملہ پر لڑنے کے لیے کھڑا ہو جائے خواہ اس لڑائی میں جان چلی جائے یا گھر بار تباہ ہو، یا دنیوی لحاظ سے زندگی برباد ہو جائے۔ ٹھیک اسی چیز کا نام انکی لغت میں ڈوبنا ہے، اور اسکے برعکس وہ تیرنا اسکو سمجھتے ہیں کہ یا تو وہ خود ارباب من دون اللہ بن جائیں یا اگر یہ نہ ہو سکے تو دوسرے ارباب کی ربوبیت میں انکو پھلنے پھولنے کا موقع مل جائے۔ اب فرمائیے کہ میں انکے ساتھ ہمدردی کس طرح کروں؟ کیا ہمدردی کے معنی یہ ہیں کہ جسے وہ تیرنا سمجھتے ہیں، اسے اپنے ضمیر اور اپنے علم کے خلاف خود بھی تیرنے سے تعبیر کرنے لگوں؟ یا ہمدردی اسکا نام ہے کہ جسے میں ڈوبنا سمجھتا ہوں اس میں جانتے بوجھتے انکے ساتھ خود بھی غرق ہونے کو تیار ہو جاؤں؟ اگر ہمدردی کا مفہوم آپکے ذہن میں یہی ہے تو معاف کیجیے، میں اس قسم کی ہمدردی کسی کے ساتھ، حتی کہ خود اپنی اولاد کے ساتھ بھی کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ ایسی ہمدردی نوح نے اپنے بیٹے کے ساتھ، ابراہیم نے اپنے باپ کے ساتھ اور محمد عربی نے اپنے قریب ترین عزیزوں کے ساتھ کرنے سے انکار کر دیا تھا علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ میں انہی کے ساتھ اپنا حشر چاہتا ہوں لہٰذا میں بھی اس سے انکار کرتا ہوں۔ میرے

نزدیک ہمدردی صرف یہ ہے کہ جسے میں علیٰ وجہ البصیرت نجات اور فلاح کا راستہ سمجھتا ہوں اسکی طرف ہر انسان کو دعوت دوں۔ اگر اسکی طرف کوئی آئے اور اسی پر جینے اور مرنے کو تیار ہو تو میرے سر اور آنکھوں پر۔ اور اگر کوئی اس طرف نہیں آتا تو اسے پکڑنے کے لیے میں اپنے راستہ سے نہیں ہٹ سکتا۔ جن راہوں میں وہ بھٹکنا چاہتا ہے، بھٹکے اور جن جن بھٹکنے والوں کے پیچھے چلنا چاہتا ہے چلے۔

میرے بعض دوست کہتے ہیں کہ تو محض ایک خیالی آدمی ہے، اور عملی سیاست سے بالکل بے بہرہ ہے۔ دیکھ تو سہی کہ مسلمان یہاں اقلیت میں ہیں، اور اکثریت ان پر غالب ہے، پھر بھلا اس حالت میں اسلام کی حکومت کا نام کس طرح لیا جاسکتا ہے۔ یہاں تو اصلی سوال صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی انفرادیت کس طرح برقرار رہے، اور جو بھی حکومت ملک میں قائم ہو اس میں مسلمان حصہ دار کیسے بنیں۔

عملی سیاست کا یہ درس سن کر مجھے ہنسی آتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے۔ یہاں پھر میرے اور انکے درمیان مسلمان کے مفہوم کا وہی اختلاف حائل ہو جاتا ہے۔ مسلمان کا جو مفہوم انکے ذہن میں ہے، اور اسکی نجات کے لیے جو تدبیریں وہ سوچ رہے ہیں انکے لحاظ سے تو میرے نزدیک ہندوستان میں مسلمان کے مستقبل پر مہر لگ چکی ہے۔ اسکی انفرادیت ۸۰ فی صدی گم ہو چکی ہے، اور ۲۰ فی صدی جو باقی ہے اسکو بھی محو ہونے سے بچایا نہیں جاسکتا، صرف تاخیر میں ڈالا جاسکتا ہے۔ بخلاف اسکے جو مفہوم مسلمان کا میرے ذہن میں ہے اسکے لحاظ سے ایک مسلمان بھی اسلام کی حکومت کا نام لینے کے لیے کافی ہے۔ ایک تن واحد بھی اگر اسلام کی روح اپنے باطن میں اور اس روح کا عملی ظہور اپنے ظاہر میں رکھتا ہے، تو اس کے اندر یہ طاقت موجود ہے کہ اسلام کی حکومت قائم کر دے، عملاً اسکی کامیابی کا امکان ہے، اور عالم واقعہ میں ایسا ہو چکا ہے۔ میں اسکی کامیابی کو نہیں بلکہ اسکی ناکامی کو مستبعد سمجھتا ہوں۔